نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں'

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

یہ نظم علامہ محمد اقبال نے اپنی والدہ کی وفات پر ان کی یاد میں لکھی تھی۔ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت علامہ نے اس میں سے کئی اشعار حذف کر دیے اور چند شعروں کا اضافہ بھی کیا اور ترتیب بھی بدل دی۔ موجودہ شکل میں نظم کُل تیرہ بندوں کے ۸۶/اشعار پر مشتمل ہے۔

علامہ اقبال کی والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ وہ ایک نیک دل، متقی اور سمجھ دار خاتون تھیں۔ ان کی پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ علامہ کے والد شیخ نور محمد جس زمانے میں سیالکوٹ کے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کی ملازمت میں پارچہ دوزی کا کام کرتے تھے، وہ اپنے شوہر کی اس تنخواہ سے اجتناب کرتیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا غالب حصّہ شرعاً جائز نہ تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد شیخ نور محمد نے ملازمت ترک کر دی۔ گھر میں انھیں 'بے جی' کہا جاتا تھا۔ وہ بالکل اَن پڑھ تھیں مگر ان کی معاملہ فہمی، ملنساری اور حُسنِ سلوک کے باعث پورا محلہ ان کا گرویدہ تھا۔ اکثر عورتیں ان کے پاس اپنے زیورات بطورِ امانت رکھوا جاتیں۔ برادری کے گھرانوں میں اگر کوئی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا تو 'بے جی' کو سب لوگ منصف ٹھیراتے اور وہ خوش اسلوبی سے کوئی فیصلہ کر دیتیں۔ 'بے جی' غریبوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔ غریب گھرانوں کی مدد کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ محلے داری کے غریب مگر شریف گھرانوں کی دس بارہ سال کی عمر کی تین چار لڑکیاں اپنے گھر لے آتیں اور ان کی کفیل ہو جاتیں۔ تین چار سال تک ان کی پوری تربیت کر کے اپنی بیٹیوں کی طرح کسی مناسب جگہ ان کی شادی کر دیتیں۔

اقبال کو اپنی والدہ سے شدید محبت اور بے حد لگاؤ تھا۔ والدہ بھی اقبال کو بہت چاہتی تھیں۔ زیرِ نظر نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اقبال یورپ گئے تو والدہ ان کی بخیریت واپسی کے لیے

دُعائیں مانگتیں اور ان کے خط کی ہمیشہ منتظر رہتیں۔ ان کا انتقال ۷۸ برس کی عمر میں ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو سیالکوٹ میں ہوا۔ ان کی وفات پر لسان العصر اکبرالٰہ آبادی نے ایک قطعہ لکھا، جس کے چند شعر یہ ہیں:

مادرِ مرحومۂ اقبال جنّت کو گئیں چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہ گیں

اکبؔر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے سال رحلت کا یہاں منظور اسے فی الحال ہے

واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات

رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہوا ہے تاریخِ وفات [۱۳۳۳ھ]

اکبر کا ایک اور قطعۂ تاریخ وفات مرحومہ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

والدہ مرحومہ کی وفات پر اقبال کو سخت صدمہ ہوا اور وہ مہینوں دل گرفتہ رہے۔ مہاراجا کشن پرشاد کے نام ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو خط میں لکھتے ہیں:

اس حادثے نے میرے دل و دماغ میں ایک شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لیے دُنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دُنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم سے وابستہ تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ موت کا انتظار ہے۔ دُنیا میں موت سب انسانوں تک پہنچتی ہے اور کبھی کبھی انسان بھی موت تک جا پہنچتا ہے۔ میرے قلب کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ وہ تو مجھ تک پہنچتی نہیں، کسی طرح مَیں اس تک پہنچ جاؤں! (صحیفہ، اقبال نمبر ۱۹۷۳ء، (اوّل)، ص ۱۳۲)

شیخ نُور محمد کو بھی اپنی رفیقۂ حیات کی جدائی کا قلق تھا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے بھی اس موقعے پر دس بارہ اشعار کی ایک نظم لکھی تھی۔ اقبال نے زیر مطالعہ نظم کاتب سے خوش خط لکھوا کر اپنے والد ماجد کو بھیجی جسے وہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔

اس نظم یا (مرثیے) کا اصل موضوع والدہ محترمہ کی وفات حسرت آیات پر فطری رنج و غم کا اظہار ہے۔ اس اظہار کے دو پہلو ہیں: ۱- فلسفۂ حیات و ممات اور جبر و قدر؛ ۲- والدہ سے وابستہ یادیں اور ان کی وفات کا ردعمل۔

پہلے موضوع کا تعلق فکر سے ہے اور دوسرے کا جذبات و احساسات سے۔ 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اُردو میں اقبال کی شاید واحد نظم ہے، جس میں وہ پڑھنے والے فکر اور جذبے دونوں کے

دام میں اسیر نظر آتے ہیں۔(سیّد وقار عظیم: اقبال، شاعر و فلسفی، ص ۳۲۲)

● **فلسفۂ جبر و قدر:** موت کے تصوّر سے اور خاص طور پر اُس وقت جب انسان کی کسی عزیز ہستی کو موت اُچک کر لے گئی ہو، حسّاس قلب پر تقدیر کی برتری اور تقدیر کے مقابلے میں انسان کی بےبسی اور بےچارگی کا نقش اُبھرنا ایک قدرتی بات ہے۔ اس لیے اس نظم کا آغاز ہی فلسفۂ جبر و قدر سے ہوتا ہے ؏

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے

پہلے بند میں بتایا گیا ہے کہ سورج اور چاند ستارے، سبزہ و گُل اور بلبل، غرض دُنیا کی ہر شے فطرت کے جبری قوانین میں جکڑی ہوئی ہے اور قدرت کے تکوینی نظام میں ایک معمولی پُرزے کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہے۔

● **انسانی ذہن پر فلسفۂ جبر کا ردِّعمل:** تقدیر کے مقابلے میں اپنی بےچارگی پر رنج و غم کا احساس اور اس پر آنسو بہانا انسان کا فطری ردِّعمل ہے۔ مگر دوسرے بند میں اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ جبر و قدر مشیتِ ایزدی ہے، اس لیے گریہ و زاری مناسب ہے۔ آلامِ انسانی کے اس راز کو پالینے کے بعد، کہ عیش و غم کا یہ سلسلہ خدا کے نظامِ کائنات کا ایک لازمی حصّہ ہے، نہ میں زندگی میں انسان کی بےبسی و بےچارگی پر افسوس کرتا ہوں اور نہ کسی ردِعمل کا اظہار کرتا ہوں۔ لیکن والدہ کی وفات ایسا سانحہ ہے کہ اس پر خود کو گریۂ پیہم سے بچانا اور خاموش رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہاں (دوسرے بند کے آخری شعر میں) اقبال نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ انسان جس قدر بھی صابر و شاکر کیوں نہ واقع ہوا ہو، زندگی میں کسی نہ کسی موقعے پر اس کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ بےاختیار آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے عالم میں زندگی کے سارے فلسفے، ساری حکمتیں اور محکم ضابطے، دُکھی دل کے ردِعمل کو روکنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں اور والدہ مرحومہ کی وفات پر مجھ پر بھی یہی کچھ بیت رہی ہے۔

● **گریہ و زاری کا مثبت پہلو:** گریہ و زاری کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے زندگی کی بنیاد مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے۔ روح کی آلودگی اور داخلی بےقراری ختم ہونے سے قبل قاری کو ایک گونہ طمانیت اور استحکام نصیب ہوتا ہے۔ جس سے انسان ایک نئے ولولے اور عزم کے ساتھ

زمانے کی سختیوں سے نبردآزما ہونے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔نفسیات دان بھی یہ کہتے ہیں کہ رونے سے انسان کے جذبات کی تسکین (catharsis) ہوتی ہے۔اقبال نے کہا ہے ع

موجِ دُودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا

● **والدہ اور بچے کا باہمی تعلق:** والدہ کی یاد میں بہائے جانے والے آنسوؤں نے دل کے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔اب وہ خود کو بالکل ہلکا پھلکا اور معصوم بچّے کی مانند محسوس کرتا ہے۔ شفیق والدہ کی یاد شاعر کو ماضی کے دریچوں میں لے گئی ہے۔جب وہ چھوٹا سا تھا اور ماں اس ننھی سی جان کو اپنی گود میں لے کر پیار کرتی اور دودھ پلاتی تھی۔اب وہ ایک نئی اور مختلف دُنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، جو علم و ادب اور شعروسخن کی دُنیا ہے اور ایک عالَم اس کی شاعری پر سر دُھنتا ہے۔ ماضی اور حال کی ان کیفیات میں اس زبردست تضاد کے باوجود، اقبال کے خیال میں ایک عمررسیدہ بزرگ یا عالم و فاضل شخص بھی جب اپنی والدہ کا تصوّر کرتا ہے تو اس کی حیثیت ایک سادہ بچّے کی رہ جاتی ہے جو ماں کی صحبت کے فردوس میں بے تکلف خوشی پاتا ہے (یہ مضمون تیسرے بند کے تیسرے شعر سے بند کے آخر تک بیان ہوا ہے)۔

● **والدہ اور بھائی سے وابستہ یادیں:** والدہ کو یاد کرتے ہوئے گذشتہ دور اور اس سے متعلق حالات و واقعات کا یاد آنا سوچ کے سفر کا حصّہ ہے۔اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے دور کو یاد کرتے ہیں، جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ میں مقیم تھے۔اس زمانے میں امام بی بی، اقبال کی سلامتی کے لیے فکرمند رہتیں، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر ان کی خیریت سے واپسی کے لیے دُعائیں مانگتیں۔ اُنھیں ہمیشہ اقبال کے خط کا انتظار رہتا۔ یہاں اقبال اپنی والدہ کی عظمت کے اعتراف میں بتاتے ہیں کہ میری تعلیم و تربیت، میری عظیم والدہ کے ہاتھوں میں ہوئی، جن کی مثالی زندگی میرے لیے ایک سبق تھی۔مگر افسوس! جب مجھے والدہ کی خدمت کا موقع ملا تو وہ دُنیا سے رخصت ہوگئیں۔البتہ بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے ایک حد تک والدہ کی خدمت کی اور اب والدہ کی وفات پر وہ بھی بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ والدہ نے اپنے پیار اور خدمت کے ذریعے اپنی محبت کا جو بیج ہمارے دلوں میں بویا تھا، غم کا پانی ملنے پر اب وہ ایک پودے کی شکل میں ظاہر ہوکر اُلفت کا تناور درخت بنتا جا رہا ہے۔

● **زندگی اور موت کا فلسفہ:** والدہ سے وابستہ باتوں کو یاد کرتے ہوئے شاعر کو تقدیر اور موت کی بے رحمی کا خیال آتا ہے۔ چنانچہ (چھٹے بند سے) سلسلۂ خیال زندگی اور موت کے فلسفے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ نظم کے آغاز میں بھی اقبال نے فلسفۂ جبر وقدر پر اظہارِ خیال کیا تھا، مگر یہاں موت اور تقدیر کے جبر کا احساس نسبتاً شدید اور تلخ ہے۔ کہتے ہیں: دُنیا میں جبر اور مشیّت کا پھندا اس قدر سخت ہے کہ کسی چیز کو اس سے مفر نہیں۔ قدرت نے انسانوں کی تباہی کے لیے مختلف عناصر (بجلیاں، زلزلے، آلام ومصائب، قحط وغیرہ) کو مامور رکھا ہے۔ ویرانہ ہو یا گلشن، محل ہو یا جھونپڑی، وہ اپنا کام کر جاتے ہیں۔ مجبور انسان اس پر آہ بھرنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے، نہ مجالِ شکوہ اور نہ طاقتِ گفتار۔ غرض زندگی گلا گھونٹ دینے والے طوق کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ کائنات کے اندر موت کے مقابلے میں زندگی کا بھی بہر حال ایک مقام اور مرتبہ ہے۔ دُنیا کی ساری رنگینیاں اور رعنائیاں زندگی اور موت کی کش مکش ہی سے قائم ہیں۔ چنانچہ ساتویں بند میں اقبال اسی دوسرے رُخ کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جبر وقدر کی یہ حکمرانی دائمی نہیں بلکہ عارضی ہے۔ موت، زندگی پر مستقل طور پر غالب نہیں آسکتی۔ کیونکہ اگر موت کو زندگی پر برتری ہوتی تو پھر زندگی کا نام ونشان بھی نظر نہ آتا اور یہ کارخانۂ کائنات نہ چل سکتا۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اصلاً زندگی اس قدر محبوب ہے کہ اس نے زندگی کو مغلوب نہیں، غالب بنایا ہے۔ لیکن انسان کو زندگی کے مقابلے میں موت اس لیے غالب نظر آتی ہے کہ اس کی ظاہر دیکھنے والی نگاہیں اصل حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں۔ موت تو ایک عارضی کیفیت کا نام ہے، جس طرح انسان لمحہ بھر کے لیے نیند کر کے پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میرتقی میر)

آٹھویں بند کے آخر میں اقبال دُنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری کی ایک توجیہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فطرت ایک بااختیار خلاق کی حیثیت رکھتی ہے جسے، بناؤ اور بگاڑ پر پوری قدرت حاصل ہے۔ فطرت کو چونکہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے، اس لیے اپنے بنائے ہوئے نقوش خود ہی مٹاتی رہتی ہے تاکہ اس تخریب سے تعمیر کا ایک نیا اور مطلوبہ پہلو برآمد ہو سکے۔

اس طرح موت اور تخریب کا جواز یہ ہے کہ اس سے حیاتِ نو کی ایک بہتر بنیاد فراہم ہوتی ہے۔

موت کو ایک عارضی کیفیت قرار دینے کے بعد اس سلسلۂ خیال کو ایک مثال کے ذریعے آگے بڑھاتے ہیں۔ نویں بند کو چھوڑ کر دسویں بند میں اقبال نے ایک بیج کی مثال دی ہے، جو مٹی کی تہہ میں دبا پڑا ہے۔ ظاہری طور پر وہ مُردہ حالت میں ہے، مگر درحقیقت وہ ایک نئی اور بہتر شکل میں زمین پر نمودار ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔

اس مُردہ دانے میں بھی زندگی کا شعلہ چھپا ہوا ہے اور اسی کے بل بوتے پر وہ زندگی کی تجدید میں مصروف ہے، لہٰذا زندگی کو موت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں___ فلسفۂ زندگی و موت سے متعلق یہ سلسلۂ خیال دسویں بند کے اختتام پر ختم ہوجاتا ہے۔

● **عظمتِ انسان**: اس کے درمیان (نویں بند میں) اقبال نے نظامِ کائنات میں انسان کے مقام اور اس کی عظمت کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ آغاز، آسمان میں چمکتے ہوئے ستاروں کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اقبال کے خیال میں ستارے اپنی تمام تر آب وتاب، چمک دمک اور عمر کی طوالت کے باوجود قدرت کے تکوینی نظام کے بے بس کارندے ہیں، اور نہ جانے کب سے ایک محدود دائرے کے اندر اپنا مقرر کردہ فرض ادا کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسان کے مقاصد کہیں زیادہ پاکیزہ تر، اس کی نگاہیں کہیں زیادہ وسیع تر ہیں اور وسیع اور اِس لامحدود کائنات میں اس کا مرتبہ کہیں زیادہ بلند تر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کائناتی نظام میں انسان کا مقام ایسا ہی ہے، جیسے نظامِ شمسی میں سورج کا مرتبہ___ اس لیے موت انسان کو فنا نہیں کرسکتی۔

● **غم و اندوہ کا ردِّعمل**: گیارھویں بند میں اقبال نے انسانی قلب و ذہن پر رنج وغم کے ردِعمل کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں لوگوں کا خیال ہے کہ 'موت کے زہر کا کوئی تریاق نہیں۔ البتہ زخمِ جدائی کے لیے وقت مرہمِ شفا کی حیثیت رکھتا ہے'۔ مگر اقبال کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جب انسان کسی شدید مصیبت سے دوچار ہو اور مصیبت بھی ناگہاں ہو تو صبر وضبط انسان کے اختیار میں نہیں رہتا۔ اس کی آنکھیں خون کا سرشک آباد بن جاتی ہیں۔ البتہ ایسے عالم میں انسان کے لیے تسکین کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے (اور یہ وہی پہلو ہے جس کی طرف اقبال نے نظم کے آغاز میں ذکر کیا تھا) کہ موت کسی دائمی کیفیت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عارضی حالت ہے۔

انسان مرتا ہے لیکن فنا کبھی نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے۔ تسکین کا دوسرا پہلو یہ ہے، جس طرح ہر رات کی سحر ہوتی ہے (اور صبح کے وقت طائرانِ سرمست نوا، نیند کو عروسِ زندگی سے ہمکنار کردیتے ہیں)، بالکل اسی طرح موت کے وقفۂ ماندگی کے بعد انسان پھر بیدار ہوکر اُٹھ کھڑا ہوگا۔ یہ اس کی زندگی کی نئی سحر ہوگی اور پھر وہ ایک نئے دور کا آغاز کرے گا (یہ بات بارھویں بند کے آخر تک بیان ہوئی ہے)۔

• **والدہ کے لیے دُعا:** نظم خاتمے کے قریب پہنچتی ہے۔ سلسلۂ خیال والدہ مرحومہ کی جانب مڑ جاتا ہے۔ ابتدا میں شاعر نے والدہ کی رحلت پر جس بے قراری، اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا، وہ والدہ سے محبت رکھنے والے ایک مغموم و متاسّف بچّے کے درد و کرب اور تڑپ کا بے تابانہ اظہار تھا۔ لیکن فلسفۂ زندگی و موت پر غوروخوض کے بعد شاعر نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ ایک پختہ کار مسلمان کی سوچ ہے۔ اقبال نے والدہ کی جدائی کے درد و غم کو اپنی ذات میں اس طرح سمولیا ہے کہ اب جدائی ایک مقدس اور پاکیزہ کیفیت بن گئی ہے ؏

جیسے کعبے میں دُعاؤں سے فضا معمور ہے

یوں کہنا چاہیے کہ اقبال نے غم کا ترفّع (sublimation) کرلیا ہے۔ وہ والدہ کی وفات اور جدائی پر اس لیے متاسّف نہیں کہ موت کے بعد آخرت بھی زندگی ہی کی ایک شکل ہے۔ آخری تین اشعار دُعائیہ ہیں۔ اقبال دُعا گو ہیں کہ جس طرح زندگی میں والدۂ ماجدہ ایک مہتاب کی مانند تھیں، جن سے سب لوگ اکتسابِ فیض کرتے تھے، خدا کرے کہ ان کی قبر بھی نُور سے معمور ہو، اور خدا ان کی لحد پر بھی اپنی رحمت کا نزول فرماتا رہے۔ 'سبزۂ نُورستہ' خدا کی رحمت کی علامت ہے۔

• **لہجے کا تنوع:** 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' ایک مرثیہ ہونے کی بنا پر یہ نظم اپنے موضوع کی مناسبت سے معتدل، نرم اور دھیما لہجہ رکھتی ہے۔ جن مقامات پر انسان کی بے بسی، قدرت کی جبریت او زندگی کی بے ثباتی کا ذکر ہوا ہے، وہاں لہجے کا سخت اور پُرجوش ہونا ممکن ہی نہیں۔ جن حصوں میں شاعر نے والدہ سے وابستہ یادِ رفتہ کو آواز دی ہے، وہاں اس کے لہجے میں درد و کرب اور حسرت کی ایک خاموش لہر محسوس ہوتی ہے۔ اس حسرت بھری خاموشی کو دھیمے پن سے بڑی مناسبت ہے۔ شاعر کے جذبات کے اُتار چڑھاؤ نے بھی اس کے دھیمے لہجے کا ساتھ دیا ہے۔ پھر الفاظ کے انتخاب، تراکیب کی بندش اور مصرعوں کی تراش سے بھی یہی بات نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صُحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

———

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دُعاؤں سے فضا معمور ہے

———

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس لہجے میں شاعر کے دل کا درد، خستگی اور حرماں نصیبی گھل مل گئے ہیں۔

نظم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں شاعر کا لہجہ، مرثیے کے مجموعی لہجے سے قدرے مختلف ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں شاعر نے فلسفۂ جبر و اختیار اور زندگی و موت پر غور و خوض کے بعد اپنے مثبت نتائج پیش کیے ہیں۔ یہ نتائج یاس و نامرادی اور افسردگی کے بجائے تعمیری نقطۂ نظر کے مظہر ہیں۔ اس لیے ایسے مقامات پر شاعر کے ہاں جوش و خروش تو نہیں، البتہ زندگی کی ایک شان اور گرمجوشی کا لہجہ ملتا ہے، مثلاً:

شعلہ یہ کمتر ہے گردُوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

———

موت ، تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے

———

سینۂ بُلبل کے زِنداں سے سرود آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے

● **سوز و گداز:** زیرِ مطالعہ نظم اپنے تاثر کے اعتبار سے اقبال کے تمام مرثیوں میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ غلام رسول مہر کے بقول اس کے اشعار اتنے پُرتاثیر ہیں کہ الفاظ میں ان کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ غالباً یہ مرثیہ شعر و ادب کی پوری تاریخ میں بالکل یگانہ حیثیت رکھتا

ہے اور شاید ہی کوئی دوسری زبان اس قسم کی نظم پیش کر سکے۔ اس انفرادیت اور اثر انگیزی کا سبب اس کا وہ سوز و گداز ہے جس سے نظم کے کسی قاری کا غیر متاثر رہنا ممکن نہیں۔ روایت ہے کہ مرثیہ پڑھتے ہوئے اس کے سوز و گداز سے ان پر گریہ طاری ہو جاتا، اور وہ دیر تک روتے رہتے۔ مرثیے میں یہ سوز و گداز اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اقبال کے پیش نظر ایک جذباتی موضوع تھا۔

● **فارسیّت**: یہ اقبال کی ان نظموں میں سے ہے، جن پر فارسی کا غالب اثر ہے۔ بعض مصرعے ایک آدھ حرف یا لفظوں کے سوا فارسی میں ہیں:

پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے

———

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے

———

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رُود باد

———

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فُروزاں ہو ترا

● **حُسنِ بیان کے چند پہلو**: فنی اعتبار سے حُسنِ بیان کا خوب صورت نمونہ ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''فن کا کمال ہی یہ ہے کہ فن کے سارے وسائل کام میں لائے گئے ہوں، لیکن ان میں ایک بھی توجہ پر بار نہ ہو''۔

نظم میں زبان و بیان، صنائع بدائع اور حُسنِ بیان کے چند پہلو ملاحظہ ہوں:

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ

———

آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

———

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دُخترانِ مادرِ ایّام ہیں

———

علم کی سنجیدہ گُفتاری، بُڑھاپے کا شعور
دُنیوی اعزاز کی شوکت ، جوانی کا غرور

جانتا ہوں آہ! مَیں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دُنیا کا سبق تیری حیات

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فُروزاں ہو ترا
نُور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

نظم کا اختتام دُعائیہ ہے۔ اقبال ایک مفکر و فلسفی کی نظر سے زندگی و موت اور جبر و قدر کے مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور ساتھ ہی دُنیا میں اپنی عزیز ترین ہستی ماں کی یاد میں مغموم اور مجبور انسان کی طرح آنکھوں سے آنسو بھی بہاتے ہیں۔ گویا یہاں: ''اقبال کی شخصیت دو مختلف اندازوں میں جلوہ گر ہوئی۔ ایک شخصیت تو اقبال کی وہی فلسفیانہ شخصیت ہے جس کی بدولت اقبال کو اُردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت ملی ہے، اور دوسری شخصیت اس مجبور و مغموم انسان کی ہے، جو ماں کی یاد میں آنسو بہاتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی ہے۔ (سیّد وقار عظیم، اقبال، شاعر اور فلسفی، ص ۱۶۳-۱۶۴)

آخر میں والدۂ مرحومہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے دست بہ دُعا ہیں کہ باری تعالیٰ مرحومہ کی قبر کو نُور سے بھر دے اور اس پر اپنی رحمت کی شبنم افشانی کرتا رہے۔ یہاں اقبال کا طرزِ فکر اور پیرایۂ اظہار ایک سچّے مومن اور راسخ العقیدہ مسلمان کا ہے۔